الطاف احمد اعظمی

ارکان حج کی حقیقت

حج اسلامی عبادات کا ایک اہم رکن ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ سب سے بڑا رکن ہے۔ امام ابوحنیفہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو اس امر میں تردد تھا کہ حج سب سے بڑی عبادت ہے، لیکن جب انھوں نے حج کیا تو ان کا یہ تردد دور ہو گیا۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ حج واقعی سب سے بڑی عبادت ہے۔

حج کی اس زبردست اہمیت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں کل عبادات جمع ہیں۔ دیکھیں، اس میں نماز بھی ہے، زکوٰۃ بھی ہے اور روزہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس عبادت کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موحدانہ زندگی کے ایک اہم واقعے سے ہے، یعنی واقعۂ ذبح۔ ان وجوہ سے حج کو اسلام میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ دیگر عبادات کی طرح یہ عظیم الشان عبادت بھی اب پورے طور پر بے اثر ہو چکی ہے۔ ہر شخص بچشم خود دیکھ سکتا ہے کہ حج کر لینے کے باوجود مسلمانوں کی زندگی میں ابراہیمی فکر ونظر کی نمود تو بڑی بات ہے، تقویٰ کی معمولی جھلک بھی جو تمام عبادات کا مقصود و مطلوب ہے، دیکھنے کو نہیں ملتی۔

حج کی اس بے اثری کی متعدد وجہیں ہیں جن میں سے ایک بڑی وجہ ارکان حج کی حقیقت سے بے خبری ہے۔ مثلاً اکثر حجاج کرام خواندہ اور ناخواندہ، دونوں یہ نہیں جانتے کہ احرام کا لباس کیوں پہنتے ہیں، تلبیہ کی صدا کیوں بلند کرتے ہیں، کعبہ کے گرد طواف کیوں کرتے ہیں وغیرہ؟ ان دنوں حج کی بے اثری کی ایک بڑی وجہ یہی ناآشنائی ہے۔ علما کی طرف سے اعمال حج کی جو توجیہات پیش کی گئی ہیں، وہ راقم کے نزدیک حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ مثلاً رمی کے عمل کو مجسم شیطان پر لعنت قرار دینا۔ یہی معاملہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا ہے۔ اس کی تاویل بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ ان وجوہ سے ہم نے خیال کیا کہ ارکان حج کی صحیح حقیقت معلوم کی جائے اور اس سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے تاکہ حج جیسی عظیم عبادت کے فیوض و برکات سے مسلم معاشرہ بہرہ ور ہو۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

احرام

یہ دو بن سلی ہوئی چادریں ہیں، جن کو حاجی حدود مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ایک متعین مقام میقات پر پہنتا ہے۔ معلوم ہے کہ نفیس لباس مرغوبات نفس میں شامل ہے اور حج کا بنیادی مقصد مرغوبات نفس کی اسیری سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ ایک حاجی جس وقت اپنا پسندیدہ لباس اتار کر احرام جیسا سادہ اور معمولی لباس پہنتا ہے تو اس سے جہاں نفس کی مخالفت ہوتی ہے اور غرور و تکبر پر جو نفس انسانی کی ایک بڑی خرابی ہے، ضرب پڑتی ہے اور طبیعت میں عاجزی اور خاک ساری پیدا ہوتی ہے، وہاں اس عمل سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ حاجی نفس کا بندہ و غلام نہیں، بلکہ خداے قدوس کا بندہ و غلام ہے۔ ابن خلدون نے اپنے ''مقدمہ'' میں لکھا ہے:

> ''احرام کی سلائی جو ممنوع ہوئی تو اس کا راز یہی ہے کہ حج کی غرض و غایت دنیوی بکھیڑوں سے رشتہ توڑ کر خدا کی طرف رجوع کرنا ہے، یہاں تک کہ انسان کا دل تکلفات کی ہر چیز سے کٹ کر اپنی لو صرف خدا سے لگا لے، نہ خوشبو استعمال کرے، نہ عورت سے خلا ملا رکھے، نہ سلا ہوا کپڑا پہنے، نہ موزہ پہنے اور نہ شکار کی طرف توجہ کرے، غرض یہ کہ نفس کی خواہشات و مرغوبات سے مکمل قطع تعلق کر لے۔'' (۴۳۷)

عمدہ لباس، سماجی حیثیت کے اظہار و امتیاز کا بھی ہمیشہ سے ایک بڑا ذریعہ رہا ہے۔ احرام دولت مندی کی اس نشانی اور سماجی امتیاز کی اس علامت کو ختم کر کے تمام عازمین حج کو برابری کے رشتے میں باندھ دیتا ہے۔ چنانچہ جملہ حجاج کرام خواہ وہ کسی ملک و علاقہ سے آئے ہوں، ایک ہی یونیفارم (احرام) میں ملبوس ہوتے ہیں۔ اب نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا، نہ کوئی امیر ہے نہ کوئی غریب، نہ کوئی حاکم ہے نہ کوئی محکوم، سب خدا کے بندے ہیں اور اس حیثیت سے خدا کی نگاہ میں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے بدویانہ زندگی پسند کی تھی۔ بابل جیسے متمدن ملک سے ہجرت کر کے آپ نے ایک نہایت غیر متمدن علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ احرام اس بدویانہ زندگی کی یاد دلاتا ہے کہ کبھی اسی بن سلے ہوئے لباس کو پہن کر جد امجد نے مکہ کی سرزمین میں قدم رکھا تھا اور خداے واحد کی عبادت کی تھی۔ اس سے ایک حاجی کو یہ سبق ملتا ہے کہ وہ لباس کے تکلفات سے ہمیشہ کے لیے آزادی حاصل کر کے سادہ لباسی کو اپنا ملی شعار بنائے۔

تلبیہ

احرام کا لباس زیب تن کرتے ہی درج ذیل الفاظ کا ورد شروع ہو جاتا ہے:

لبیك ، اللّٰھم لبیك ، لبیك ، لا شریك لك، لبیك . ان الحمد والنعمة لك	''حاضر ہوں، اے اللہ حاضر ہوں۔ حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، حاضر ہوں۔ سب تعریف تیرے لیے اور

والملك لا شريك لك . (مسلم، کتاب الحج۔ موطا، کتاب الحج) | سب نعمتیں تیری ہی ہیں، اور بادشاہی میں تیرا کوئی شریک نہیں۔''

اس ورد کو اصطلاح حج میں تلبیہ کہتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی ہیں: لبیک کہنا، پکار کا جواب دینا۔ یہاں سوال پیدا ہوگا کہ آخر یہ کس پکار کا جواب ہے، اور یہ پکار کیوں لگائی گئی تھی؟ ہم لکھ چکے ہیں کہ جس وقت خانۂ کعبہ کی تعمیر مکمل ہوگئی تو اللہ نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ وہ اس گھر کے حج کی منادی کر دیں[1]۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان مبارک سے حج کا یہ اعلان تقریباً چار ہزار سال پہلے مکہ کی پہاڑیوں کے اوپر سے ہوا تھا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صدا کل ہی بلند ہوئی ہے اور لوگ جوق در جوق اس پکار کے جواب میں خدا کے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ تلبیہ دراصل ابراہیمی پکار کا جواب ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ لوگوں سے پکار کر کہہ دو کہ وہ اس گھر کے حج کے لیے آئیں تو آپ نے فرمایا:

یا رب کیف أبلغ الناس وصوتی لا ینفذهم فقال ناد، وعلینا البلاغ . فقام علی الحجر و قال، یا ایها الناس ان ربکم قد اتخذ بیتا فحجوه . (تفسیر ابن کثیر ۳/۲۱۶) | ''اے رب، میں یہ بات کیسے لوگوں تک پہنچاؤں۔ میری آواز ان تک نہیں پہنچے گی۔ اللہ نے کہا، تم پکارو، اس پکار کو لوگوں تک پہنچانا ہمارے ذمہ ہے۔ پس حضرت ابراہیم پتھر پر کھڑے ہوئے اور کہا: اے لوگو، تمھارے رب نے ایک گھر کو مقرر کیا ہے، پس تم اس کا حج کرو۔''

سبحان اللہ، اس صدائے دل نواز کا بلند ہونا تھا کہ زمین کے فاصلے سمٹ گئے، سمندروں، پہاڑوں اور جنگلوں کی قدرتی رکاوٹیں گویا درمیان سے ہٹ گئیں اور دنیا کے گوشے گوشے تک یہ ربانی پیغام پہنچ گیا۔ اور اس شان سے پہنچا کہ آج تک دنیا کے ہر کونے سے، ہر بلندی اور پستی سے اور ہر خشکی اور تری سے ''حاضر ہوں'' کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور بلاکشان محبت کے قافلہ ہائے تیز گام اس پیغام کے مرکز کی طرف کشاں کشاں چلے آ رہے ہیں تاکہ وہاں پہنچ کر آستان الٰہی پر جبین نیاز جھکائیں اور اس کی غلامی کے داغ سے اپنی پیشانی کو آراستہ کریں۔

تلبیہ دراصل حاجی کا روحانی ترانہ ہے اور جس وقت ایک جم غفیر یہ ترانۂ جاں نواز پڑھتا ہے تو اس سے ایک ایسا روحانی ماحول پیدا ہوتا ہے کہ قلوب خود بخود خدا کی اطاعت و بندگی کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں اور تسلیم و رضا کے جذبات اس درجہ غالب آ جاتے ہیں کہ دل و دماغ میں کسی اور جذبہ و خیال کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ عشق و محبت کے اس زمزمۂ جنوں انگیز کو سن کر ممکن ہی نہیں کہ دل کی دنیا میں کوئی ہنگامہ نہ ہو اور سفینۂ حیات جذبات محبت کی تلاطم خیزی میں ہچکولے نہ کھانے لگے۔ ''حاضر ہوں، حاضر ہوں'' کی پرجوش صداؤں سے عالم ناسوت تو کیا عالم لاہوت بھی گونج اٹھتا ہوگا، اور فرشتے محبت الٰہی کا یہ عدیم

---

[1] و اذن فی الناس بالحج ... عمیق۔ (الحج ۲۲: ۲۷)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

المثال منظر دیکھ کر یقیناً آئینۂ حیرت بن جاتے ہوں گے۔

طواف کعبہ

حدود حرم میں قدم رکھتے ہی حاجی اس گھر کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اس کے سفر کی منزل مقصود ہے۔ یعنی خانۂ کعبہ جو خدا کا پہلا گھر ہے اور جس کی تعمیر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام جیسی خدا کی برگزیدہ اور مقدس ہستیوں کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائی ہے۔ قرآن مجید کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خانۂ کعبہ دراصل قربان گاہ ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَكُمۡ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡهَدۡىُ مَحِلَّهٗ. (البقرہ ۲:۱۹۶)

''اور اپنے سروں کو اس وقت تک نہ منڈواؤ جب تک کہ ہدی (قربانی) اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔''

قرآن مجید کی تصریح کے مطابق یہ 'محل' 'بیت عتیق' ہے۔ فرمایا ہے:

لَكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ. (الحج ۲۲:۳۳)

''اور تمھارے لیے ان ہدی کے جانوروں میں ایک متعین مدت تک مختلف قسم کے فائدے ہیں پھر ان کو قربانی کے لیے قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔''

ایک دوسرے مقام پر نام لے کر اس قدیم گھر کا ذکر بحیثیت قربان گاہ کیا گیا ہے:

يَحۡكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ هَدۡيًا بٰلِغَ الۡكَعۡبَةِ. (المائدہ ۵:۹۵)

''جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر آدمی کریں گے۔ یہ (یعنی بدلے کا جانور) نیاز کی حیثیت سے خانۂ کعبہ کو پہنچایا جائے۔''

جب مکہ کی آبادی بڑھ گئی اور حاجیوں کی کثرت ہوئی تو اس قربان گاہ کو منیٰ تک وسیع کر دیا گیا، لیکن اس کا معنوی رشتہ خانۂ کعبہ سے قائم رکھا گیا۔ چنانچہ منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی فوراً ہی مکہ پہنچ کر اصلی قربان گاہ یعنی خانۂ کعبہ کا طواف کرتا ہے جو طواف زیارت کے نام سے موسوم ہے، اور یہ لازمی ہے۔ اس عمل سے ثابت ہوا کہ خانۂ کعبہ قربان گاہ بھی ہے۔

تاریخ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہودیوں میں نذر و قربانی کے لیے ایک ضروری شرط یہ تھی کہ اس کو مذبح کے سامنے سات مرتبہ پھیرا جائے[2]۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ خداوند کے حضور یعنی بیت اللہ کے سامنے لائی جائے[3]۔

خانۂ کعبہ کے گرد طواف کے سات پھیرے اور اس میں رمل دراصل ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ طریقۂ نذر و قربانی کی نقل ہے۔ خانۂ کعبہ کے گرد سات پھیرے لگا کر حاجی دراصل اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خود کو خدا کی نذر کر چکا ہے، اس

---

[2] گنتی ۶:۵، ۹۔

[3] احبار ۸:۲۷، ۱۴، ۲۱، ۲۴۔ خروج ۲۹:۲۶۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کا جینا و مرنا سب اسی کے لیے ہے۔

افسوس کہ آج اکثر حاجی طواف کی اس حقیقت سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں اور بے سوچے سمجھے کسی طرح سات پھیرے پورے کر دیتے ہیں۔ خدا کے لیے اپنی زندگی وقف کرنا تو بڑی بات ہے، اکثر لوگ حج سے فراغت کے بعد اس طرح آزاد و خود مختار ہو جاتے ہیں گویا انھوں نے خانۂ کعبہ کے گرد طواف کر کے خود کو اللہ کے حوالے کیا ہی نہیں تھا۔

حجر اسود کا استلام

حجر اسود، ناہموار، مگر چمک دار سیاہ سرخی مائل، بیضوی شکل کا ایک پتھر ہے جو چاندی کے خول میں خانۂ کعبہ کے ایک گوشے میں کچھ بلندی پر نصب ہے[4]۔ یہ پتھر نہایت قدیم ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہزاروں سال پہلے جس گھر کی تعمیر کی تھی، اس گھر کا صرف یہی ایک پتھر آج باقی رہ گیا ہے جو برابر اس کی قدامت کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ اسی پتھر کو لبوں یا ہاتھوں سے مس کر کے خانۂ کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے۔ یقیناً اس پتھر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مقدس لبوں نے بوسہ دیا ہوگا اور خود ہمارے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے اپنے پاکیزہ ہاتھوں اور لبوں سے اس کو چھوا ہے۔ اس کے بعد سے آج تک امت مسلمہ کے بے شمار صلحا و اتقیا نے اس عمل کو جاری رکھا اور انشاء اللہ ابدالآباد تک یہ حسین عمل جاری رہے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کا طواف شروع کرنے سے پہلے اس پتھر کو بوسہ کیوں دیا جاتا ہے یا اسے ہاتھوں سے کیوں چھوا جاتا ہے؟ یہ بات طے ہے کہ وہ نفع و ضرر پہنچانے کی کوئی طاقت نہیں رکھتا۔ حضرت عمر فاروق نے ایک بار دوران طواف میں اس پتھر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن میں تجھ کو صرف اس لیے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ہرگز بوسہ نہ دیتا[5]۔ موطا کے الفاظ ہیں:

انما انت حجر ولولا انی رأیت رسول اللّٰه قبلك ما قبلتك ثم قبله. (موطا، کتاب الحج)

---

[4] دور جاہلیت میں خانۂ کعبہ کو آگ لگ گئی تو یہ پتھر بھی جھلس گیا تھا۔ ۶۴ ہجری میں حضرت عبد اللہ بن زبیر اور حجاج کی فوجوں میں لڑائی کے نتیجے میں یہ پتھر تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ ابن زبیر نے چاندی کے موٹے خول کے اندر ان ٹکڑوں کو رکھ کر دیوار میں نصب کر دیا۔ ۱۸۹ ہجری میں عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے ان ٹکڑوں میں سوراخ کرا کے ان کو چاندی سے خوب اچھی طرح باہم پیوست کر دیا۔ ۳۱۷ ہجری میں قرامطہ نے مکہ پر قبضہ کر لیا اور حجر اسود کو اکھاڑ کر بحرین لے گئے۔ ۲۲ سال کے بعد یہ دوبارہ اپنی جگہ پر نصب کیا گیا اور آج تک اسی حال میں موجود ہے۔

[5] مسلم، کتاب الاستلام۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اگر استلام کی حقیقت اتنی ہی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس مرد مومن نے پہلی بار اس پتھر کو بوسہ دیا تھا، اس نے یہ عمل کیوں کیا تھا؟ ہمارے علما نے کافی غور وفکر کے بعد اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حجر اسود طواف کے آغاز و اختتام کی علامت ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا اور اسی لیے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے۔ اس گوشہ کے تحقق سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے۔ اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے[٦]۔''

(سیرت النبی ۵/۳۶۷)

یہ ایک قیاسی توجیہ ہے۔ اگر حجر اسود طواف کے آغاز و اختتام کی علامت ہے تو حاجی اس کو بوسہ کیوں دیتا ہے؟ اس توجیہ کی خامی محسوس کر کے بعض علما نے اس سے مختلف خیال پیش کیا ہے۔ مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

''حجر اسود کو حدیث میں 'ید اللّٰہ علی الارض' (زمین پر خدا کا ہاتھ) کہا گیا ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں نہیں، بلکہ تمثیلی معنوں میں ہے۔ آدمی کے اندر اٹھنے والے ربانی جذبات اپنی محسوس تسکین کے لیے یہ چاہتے تھے کہ وہ اللہ کے ہاتھ کو چھوئیں اور اس کو چھو کر اپنے جذبے کو مطمئن کریں۔ حجر اسود کو چوم کر آدمی اپنے اس جذبہ کی تسکین حاصل کرتا ہے۔''

(حقیقت حج ۷۴)

'ید اللّٰہ' کی یہ تعبیر صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ حجر اسود عہد کی نشانی ہے۔ اگر اس کو ہم تمثیل کی زبان میں کہیں تو کہہ سکتے کہ وہ دراصل خدا کے ہاتھ کا قائم مقام ہے۔ خدا کی ذات تجسم سے پاک اور بے جہت و بے مکان ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ بندہ فی الواقع اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر کوئی عہد و پیماں کرے۔ اس لیے خداے رحیم نے اس پتھر کو تمثیلاً اپنا ہاتھ قرار دیا، تاکہ اس کے بندے محسوس سطح پر یہ سمجھیں کہ وہ گویا اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اس سے عہد اطاعت باندھ رہے ہیں۔ کسی فعل کے تکرار سے اس میں پختگی آتی ہے۔ خانۂ کعبہ کے ہر طواف میں حجر اسود کا استلام دراصل خدا سے باندھے ہوئے عہد غلامی کی تجدید و توثیق ہے۔ آج بھی جب دو اشخاص کوئی پختہ عہد و میثاق کرتے ہیں تو ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس بات کو ظاہر کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الرکن یعنی الحجر یمین اللّٰہ فی الارض یصافح بها خلقه مصافحة الرجل أخاه. (مصنف عبد الرزاق، رقم ۸۹۱۹)

''حجر اسود اس دنیا میں خداے بزرگ و برتر کا دایاں ہاتھ ہے اور اس سے اسی طرح مصافحہ کیا جاتا ہے جس طرح ایک شخص اپنے بھائی سے مصافحہ کرتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ خدا سے مصافحہ کے وہ معنی نہیں جو عرف عام میں لیے جاتے ہیں۔ یہ مصافحہ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے،

---

٦ مزید دیکھیں: حجۃ اللہ البالغہ ۲: ۴۴۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دراصل عہد کا مصافحہ ہے۔ ہم جس وقت حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں تو کہتے ہیں:

اللھم ایمانا بك و تصدیقاً بکتابك و وفاء بعھدك.	''اے اللہ تجھ پر ایمان کے ساتھ، تیری کتاب کی تصدیق کے ساتھ اور تجھ سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کرنے کے ساتھ۔''

'و وفاء بعھدك' کے الفاظ سے بالکل ظاہر ہے کہ استلام کی حقیقت وفائے عہد کا اظہار و اقرار ہے۔

استلام کی ایک قدیم مذہبی تعبیر بھی ہے۔ ماضی میں جب خدا کے نیک بندے کسی معاملے کی اہمیت ظاہر کرنا چاہتے تو عبادت کے پتھر کو گواہ بناتے تھے۔

کتاب یشوع میں لکھا ہے:

''اور یشوع نے یہ باتیں خدا کی شریعت کی کتاب میں لکھ دیں اور ایک بڑا پتھر لے کر وہیں اس بلوط کے درخت کے نیچے جو خداوند کے مقدس کے پاس تھا، نصب کیا۔ اور یشوع نے سب لوگوں سے کہا کہ دیکھو یہ پتھر ہمارا گواہ ہے، کیونکہ اس نے خداوند کی سب باتیں جو اس نے ہم سے کہیں، سنی ہیں اس لیے یہی تم پر گواہ رہے تا نہ ہو کہ تم اپنے خدا کا انکار کر جاؤ۔''

(۲۴: ۲۶۔ ۲۷)

بلاشبہ یہ پتھر روز قیامت خدا کے حکم سے گواہی دے گا کہ اس کے فلاں فلاں بندوں نے بوسہ دے کر اس کو گواہ بنایا تھا۔[1] بہر حال حجر اسود کو خواہ عہد کا پتھر مانیں یا شہادت کا، اعمال حج میں اس کی غیر معمولی اہمیت بالکل واضح ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ استلام کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو عام طور پر علما نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔

عمل سعی

صفا اور مروہ کے درمیان سعی اعمال حج میں داخل ہے۔ یہ دراصل دو پہاڑیاں ہیں جو خانۂ کعبہ سے متصل ہی واقع ہیں۔ طواف کعبہ سے فراغت کے بعد ان دو پہاڑیوں کے درمیان تیز قدموں سے چلنے کو سعی کہا جاتا ہے۔ اس عمل کو حضرت ہاجرہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرزند حضرت اسماعیل کو پیاس سے بے تاب دیکھ کر پانی کی تلاش میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان دوڑی تھیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل کو لے کر جب یہاں آئی تھیں، اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہ صفا اور مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں، اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا۔ یہ صفا و مروہ کی سعی انھی کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے۔'' (سیرت النبی ۵/ ۳۶۹)

اس خیال کی بنیاد وہ روایت ہے جو بخاری میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

---

[1] اکثر علما و مفسرین کی یہی رائے ہے، دیکھیں تفسیر کبیر ۶/ ۴ ۱۷۔ حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۱۷۰۔

’’حضرت ابراہیم، حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیل کو جب کہ وہ ابھی دودھ پی رہے تھے لے کر آئے اور ان کو ایک درخت کے نیچے اس جگہ چھوڑ دیا جہاں بعد میں زم زم نکلا، مکہ کی سنسان وادی میں اس وقت کوئی ایک انسان بھی موجود نہ تھا اور نہ کہیں پانی پایا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم نے چمڑے کا ایک تھیلا جس میں کھجوریں تھیں اور پانی کا مشکیزہ ہاجرہ کو دیا اور واپس روانہ ہوئے۔ وہ ان کے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں: اے ابراہیم، کہاں جاتے ہو؟ اور ہمیں سنسان اور بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑے جاتے ہو؟ یہ بات حضرت ہاجرہ نے کئی مرتبہ کہی، مگر حضرت ابراہیم نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ جواب میں انھوں نے بس اتنا ہی فرمایا کہ ہاں۔ اس پر وہ بولیں اگر یہ بات ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا۔ اور پلٹ کر بیٹے کے پاس آ بیٹھیں۔ حضرت ابراہیم جب پہاڑ کی اوٹ میں پہنچے جہاں سے یہ ماں بیٹا نظر نہ آتے تھے تو بیت اللہ کی طرف (یعنی اس جگہ کی طرف جہاں آخر کار انھیں بیت اللہ تعمیر کرنا تھا) رخ کیا اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا:

رَبَّنَآ اِنِّیۡ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِیۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِیۡۤ اِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ. (ابراہیم ۱۴:۳۷)

’’پروردگار میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے، پروردگار یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ وہ نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے۔ شاید کہ شکر گزار بنیں۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ادھر اسماعیل کی والدہ ان کو دودھ پلاتی رہیں اور مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں۔ جب پانی ختم ہو گیا تو انھیں اور بچے کو پیاس لگنی شروع ہوئی۔ وہ بچے کو تڑپتا ہوا دیکھتی رہیں، آخر بچے کی حالت ان سے نہ دیکھی گئی اور وادی کی طرف یہ دیکھنے کے لیے چل پڑیں کہ کوئی آدمی نظر آئے، مگر کوئی نظر نہ آیا پھر صفا کی پہاڑی سے اتر کر وادی کے بیچ میں آئیں اور اپنا بازو اٹھا کر اس طرح دوڑیں جیسے کوئی مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ پھر مروہ کی پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں کہ کوئی آدمی نظر آتا ہے یا نہیں، مگر کوئی نظر نہ آیا۔ یہ فعل انھوں نے (صفا اور مروہ کے درمیان) سات مرتبہ کیا۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی وجہ سے لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ آخری مرتبہ جب وہ مروہ کی پہاڑی پر چڑھیں تو انھوں نے ایک آواز سنی۔ اپنے آپ سے کہنے لگیں، چپ رہ (یعنی شور مچانا بند کر) اور غور سے سننے لگیں۔ آواز پھر آئی۔ انھوں نے کہا: اے شخص تو نے مجھے اپنی آواز تو سنا دی، لیکن کیا تیرے پاس میری مصیبت کا کوئی علاج بھی ہے؟ انھوں نے زم زم کے مقام پر ایک فرشتے کو دیکھا جو اپنے بازو سے زمین کھود رہا تھا یہاں تک کہ وہاں پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ اپنے مشکیزے کو پانی سے بھرنے لگیں، اور جوں جوں وہ پانی بھرتی گئیں پانی کی مقدار بڑھتی گئی اور وہ ابل کر اوپر آتا رہا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: اللہ اسماعیل کی ماں پر رحمت فرمائے۔ اگر وہ زم زم کو اس کی اصلی حالت میں چھوڑ دیتیں تو آج زم زم ایک بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔ حضرت ہاجرہ اسی طرح چشمہ سے پانی پینے لگیں اور بچے کو بھی دودھ پلاتی رہیں۔ فرشتے نے ان سے کہا: تم کسی خوف اور اندیشے میں مبتلا نہ ہو۔ اس مقام پر اللہ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ، دونوں مل

کر بنائیں گے، اور اللہ اس گھر کے لوگوں کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔‘‘ (بخاری، رقم ۳۱۸۴)

بخاری کی یہ روایت مرفوع نہیں ہے، البتہ اس کے بعض فقرے ضرور مرفوع ہیں، یعنی ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ روایت اصول درایت پر پوری نہیں اترتی، اس لیے غلط ہے۔ پہلے اس روایت کا وہ حصہ لیں جو غیر مرفوع ہے۔ یہ حصہ صریحاً تورات سے ماخوذ ہے۔ عبارت ذیل ملاحظہ ہو:

’’ابراہیم صبح سویرے اٹھا اور روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ حضرت ہاجرہ کے کندھے سے لٹکا دیا اور انھیں گھر سے روانہ کر دیا حضرت ہاجرہ وہاں سے نکل کر بیر سبع کے بیابان میں ادھر ادھر پھرنے لگیں یہاں تک کہ پانی ختم ہو گیا۔ انھوں نے بچہ کو ایک جھاڑی میں ڈال دیا اور خود تھوڑے فاصلہ پر اس خیال سے کہ بچے کو مرتے ہوئے دیکھ نہ سکیں، جا کر بیٹھ گئیں اور زور زور سے رونے لگیں۔ خدا نے بچے کی آواز کو سنا اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے حضرت ہاجرہ کو پکارا اور کہا: کیا بات ہے ہاجرہ؟ خوف نہ کرو۔ خدا نے بچہ کی آواز سن لی ہے۔ اٹھو اور بچہ کو اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لو۔ اس لیے کہ میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ اس کے بعد خدا نے اس کی آنکھوں کو کھول دیا اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور وہاں جا کر اس نے اپنے مشکیزے کو بھرا اور بچہ کو پانی پلایا۔‘‘ (پیدایش ۲۱: ۱۴۔ ۱۹)

قارئین نے دیکھ لیا کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ تورات اور بخاری کے بیانات ایک سے ہیں اور دونوں میں مافوق الفطری عنصر غالب ہے۔ بخاری کی روایت میں یہ عنصر زیادہ ہے، مثلاً فرشتے کا اپنے بازوؤں سے زمین کھودنا، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ محض ایک افسانہ ہے۔ اس کے غیر مرفوع حصے کا مرکزی خیال بھی محل نظر ہے۔ یعنی کم سنی میں حضرت اسماعیل کا مکہ میں آباد ہونا۔ خود اسی روایت سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ روایت میں ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیم اپنی بیوی اور بچے کو وادی مکہ میں یکہ و تنہا چھوڑ کر جانے لگے تو اس مقام پر پہنچ کر جہاں بعد میں خانۂ کعبہ تعمیر ہوا، فرمایا:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ. (ابراہیم ۱۴: ۳۷)

’’پروردگار، میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں۔‘‘

سوال یہ ہے کہ ابھی خانۂ کعبہ تعمیر نہیں ہوا تھا تو یہ کہنا کہ میں نے تیرے گھر کے پاس اپنی ذریت کو آباد کیا، کس طرح صحیح ہو گا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا اس وقت کی جب خانۂ کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی اور اس تعمیر میں خود حضرت اسماعیل علیہ السلام شریک تھے۔[8]

صحیح بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کو وادی مکہ میں اس وقت آباد کیا، جب واقعۂ ذبح پیش آ چکا تھا۔ قرآن کا بیان ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت اسماعیل دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔[9] علما اور مفسرین کا

۸۔ البقرہ ۲: ۱۲۷۔

www.javedahmadghamidi.com

بیان ہے کہ اس وقت ان کی عمر لگ بھگ پندرہ سولہ برس کی تھی۔[۱۰] اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ واقعۂ ذبح کا خواب آپ نے وادی مکہ کے بجائے بیر سبع میں دیکھا تھا جہاں وہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کے ساتھ رہتے تھے۔ تورات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، گو کہ اس میں ذبیح حضرت اسحاق کو قرار دیا گیا ہے:

''ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اس سے کہا: اے ابرہام! اس نے کہا، میں حاضر ہوں، تب اس نے کہا: اپنے بیٹے اسحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریا کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔ تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر اپنے گدھے پر چار جامہ کسا اور اپنے ساتھ دو جوانوں اور اپنے بیٹے اسحاق کو لیا اور اس سوختنی قربانی کے لیے لکڑیاں چیریں اور اٹھ کر اس جگہ کو جو خدا نے بتائی تھی روانہ ہوا۔ تیسرے دن ابرہام نے نگاہ کی اور اس جگہ کو دور سے دیکھا۔ تب ابرہام نے اپنے نوکروں سے کہا کہ تم لوگ یہاں ٹھہرو میں اور میرا یہ فرزند وہاں جائیں گے اور عبادت کر کے لوٹ آئیں گے ... فرشتہ نے کہا: تم بچے کے خلاف ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ ہم نے جان لیا کہ تو خدا ترس ہے ... ابرہام نے مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے اس کی قربانی کی ... تب ابرہام اپنے جوانوں کے پاس لوٹ گیا اور وہ اٹھے اور اکٹھے بیر سبع کو گئے اور ابرہام بیر سبع میں رہا۔''

(پیدایش ۲۲: ۱۔۱۹)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآن اور تورات، دونوں کے مذکورہ بیانات سے بالکل واضح ہو گیا کہ بخاری کی روایت کا غیر مرفوع حصہ یعنی حضرت اسماعیل کا کم سنی کی حالت میں مکہ میں ورود وغیرہ بالکل وضعی ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

روایت کے غیر مرفوع حصے کی وضعیت ثابت ہو جانے کے بعد اس کا مرفوع حصہ بھی ساقط الاعتبار ہو جاتا ہے۔ روایت میں کہا گیا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا تعلق حضرت ہاجرہ سے ہے جو اپنے بچے کی خاطر پانی کی تلاش میں ان دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑی تھیں، لیکن قرآن مجید سے اس بیان کی تردید ہوتی ہے۔

قرآن میں صفا اور مروہ کو شعائر اللہ کہا گیا ہے،[۱۱] لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ دوڑی تھیں، بلکہ اس لیے کہ واقعۂ قربانی ان پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی مروہ پر پیش آیا تھا۔ صفا کو اس سعی میں اس لیے شامل کر لیا گیا ہے کہ اسی پہاڑی پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے مقام ذبح کو دیکھا تھا اور خدا کے حکم کی تعمیل میں تیزی کے ساتھ مروہ کی طرف دوڑ کر گئے تھے، اور پھر اسی پہاڑی پر آ کر کے اور بیر سبع کی طرف گئے، جیسا کہ تورات کی مذکورہ عبارت

---

۹ الصافات ۳۷: ۱۰۲۔

۱۰ حضرت اسماعیل کا یہ کہنا: 'یا ابت افعل ما تومر ستجدنی ان شاء اللّٰہ من الصابرین. (الصافات ۳۷: ۱۰۲) ظاہر کرتا ہے کہ وہ سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔

۱۱ ان الصفا والمروۃ من شعائر اللّٰہ ... علیم۔ (البقرہ ۲: ۱۵۸)

سے بالکل واضح ہے۔

یہ بات کہ مروہ ہی مقام ذبح ہے، قرآن مجید اور حدیث، دونوں سے ثابت ہے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے:

يَـآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ. الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ. وَاُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ. اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ.

’’اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد لو۔ بے شک اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، لیکن تم نہیں جانتے۔ بے شک ہم تم کو آزمائیں گے، خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے، اور ان صابرین کو خوش خبری سنا دو جو مصیبت سے دوچار ہونے کے بعد بس اتنا ہی کہتے ہیں کہ ہم بے شک اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ انھی لوگوں پر ان کے رب کی رحمت اور عنایتیں ہیں، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔‘‘

(۲: ۱۵۳۔۱۵۸)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ان آیات میں اللہ کی طرف سے پیش آنے والی ابتلا و آزمایش میں ثابت قدم رہنے والوں کو مژدہ سنایا گیا ہے کہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس آیت ابتلا کے فوراً بعد صفا اور مروہ کا ذکر ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر کسی شخص کو صبر و ثبات کی فضیلت اور اس کے حاملین کے حق میں وعدۂ خداوندی میں شک ہو تو وہ ان دونوں تاریخی مقامات صفا اور مروہ کو دیکھ لے، جہاں اللہ تعالیٰ کے دو نیک بندوں نے عدیم المثال صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا تھا اور جس کے نتیجے میں وہ اللہ کی نظر میں برگزیدہ ٹھہرے اور اس کی رحمتوں اور نوازشوں سے مالا مال ہوئے۔ ’انا كذالك نجزى المحسنين‘[۱۲]۔

مابعد کی آیات سے بھی مذکورہ خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ

’’بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ان کھلی ہوئی نشانیوں اور

۱۲؎ تورات میں ہے:

’’چوں کہ تو نے یہ بڑا کام کیا اور اپنے بیٹے کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کیا، میں تم کو یقیناً برکت دوں گا، اور تمھاری ذریت کو آسمان کے ستاروں اور سمندر کی ریت کے مانند پھیلاؤں گا، اور تمھاری نسل دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تمھاری ذریت کے واسطہ سے زمین کی تمام قومیں فیض یاب ہوں گی۔ یہ اس لیے کہ تو نے میری بات مانی اور میرے حکم کو بجالایا۔‘‘

(پیدایش ۲۲: ۱۶۔۱۸)

وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ. (البقره ۲:۱۵۹)

ہدایت کو جو ہم نے نازل کی ہیں، اس کے بعد بھی کہ ہم نے کتاب میں وضاحت کے ساتھ لوگوں کے لیے بیان کر دی تھیں۔‘‘

صفا اور مروہ کے ذکر کے بعد متصلاً اس آیت میں جس کتمان کی بات کہی گئی ہے، اس کا تعلق مروہ یعنی مقام ذبح سے ہے جس کو یہودی علما چھپاتے تھے۔ حدیث میں بھی ہے کہ مروہ ہی مقام ذبح ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

هذا المنهر يعني المروة و كل فجاج مكة و طرقها منهر. (موطا، رقم ۸۸۵)

’’مروہ ہی قربان گاہ ہے، اور مکہ کی تمام گلیاں اور اس کے اطراف بھی۔‘‘

مذکورہ دلائل وشواہد کی روشنی میں ہم پورے شرح صدر کے ساتھ کہتے ہیں کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا تعلق واقعۂ قربانی سے ہے نہ کہ حضرت ہاجرہ کی بے تابانہ سعی سے جو تمام تر تورات سے ماخوذ ہے جیسا کہ تفصیل سے بیان ہوا۔

صفا اور مروہ کے درمیان سات بار سعی کی علت بھی اسی وقت سمجھ میں آتی ہے، جب ہم مان لیں کہ مروہ مقام ذبح ہے اور یہاں سات پھیرے اسی طرح لگائے جاتے ہیں جس طرح خانۂ کعبہ کے گرد لگائے جاتے ہیں جو خدا کا گھر ہے اور ابراہیمی قربان گاہ بھی۔ اس سعی کو حضرت ہاجرہ کی طرف منسوب کرنے کی صورت میں سات پھیروں کی توجیہ مشکل ہے[۱۳]۔ کیا وہ پانی کی تلاش میں دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات بار دوڑی تھیں؟

اس کے برخلاف سعی کو واقعۂ ذبح سے جوڑ کر دیکھیں تو اس کا مفہوم ومدعا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان حاجی کا سات بار چکر لگانا دراصل قربان گاہ اسماعیل کے گرد چکر لگانا ہے۔ اس سعی سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حاجی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح خدا کی رضا کی خاطر قربان ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔

سعی کی اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے حج کا یہ عمل بالکل رسمی بن گیا ہے۔ حاجی یہ سوچ کر سعی کر لیتا ہے کہ کبھی ان دو پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس دوڑ کے وقت اس کے دل کی وہ کیفیت نہیں ہو سکتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں اس وقت موج زن تھی جب وہ اپنے لخت جگر کو اس مقام پر ذبح کرنے کے لیے بے تابانہ دوڑ کر پہنچے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

۱۳؎ مولانا فراہی نے اپنی تصنیف ’’الرائ الصحیح فیمن هو الذبیح‘‘ میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو حضرت ابراہیم کی اس مستعدی کی طرف منسوب کیا ہے جو انھوں نے حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے میں دکھائی تھی۔ یہ توجیہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انھوں نے صفا اور مروہ کے درمیان سات بار اس سرگرمی کا مظاہر کیا تھا؟ صحیح بات یہ ہے کہ مروہ حضرت اسماعیل کا مقام ذبح ہے اور بایں طور اس کی حیثیت قربان گاہ کی ہے۔ چوں کہ یہ سعی اس پہاڑی کے اوپر بآسانی ممکن نہ تھی، اس لیے صفا اور مروہ کے درمیان کی قدرے ہموار جگہ پر اس کو مقرر کیا گیا ہے۔

یہ حج کا سب سے بڑا رکن ہے۔ حدیث میں ہے کہ: 'الحج عرفه' (عرفہ میں قیام ہی حج ہے)۔ اگر کسی نے سارے ارکان حج ادا کیے اور کسی واقعی معذوری کے بغیر وہ میدان عرفات میں حاضر نہیں ہوا تو اس کا حج نہیں ہوا۔ دوسرے ارکان حج میں گو کہ وہ متعین دنوں میں انجام دیے جاتے ہیں، اگر کسی وجہ سے تقدیم وتاخیر ہو جائے تو حج میں کوئی خرابی نہیں آتی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں قیام کے دوران میں صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور پوچھتے کہ یا رسول اللہ ہم نے ناواقفیت میں فلاں عمل پہلے کر لیا اور فلاں عمل موخر ہو گیا ہے تو آپ فرماتے: 'افعل ولا حرج'' 'اب کر لو، اس میں کوئی حرج نہیں۔'' لیکن قیام عرفہ میں کسی طرح تقدیم وتاخیر کی اجازت نہیں ہے۔ ایک خاص وقت میں وہاں جمع ہونا اور ایک خاص وقت پر وہاں سے رخصت ہونا لازمی ہے۔

قیام عرفہ کے اس اہتمام والتزام کی جو وجہ علما نے بیان کی ہے، وہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ اکثر علما نے قیام عرفہ کو روز حشر کی ایک تمثیل قرار دیا ہے[14] جو راقم کے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ معلوم ہے کہ حج کے سارے اعمال بیت عتیق یعنی خانۂ کعبہ سے متعلق ہیں اور خانۂ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعمیر کردہ عمارت ہے اور اس کو خدا کی پہلی عبادت گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وادی مکہ جس میں خانۂ کعبہ واقع ہے، ایک مختصر جگہ ہے جہاں تمام فرزندان توحید کا اجتماع اور اعمال حج کی ادائیگی ممکن نہ تھی، اس لیے اس کے دائرے کو بڑھا کر عرفات تک وسیع کر دیا گیا۔ اس طرح اب منیٰ کی حیثیت قربان گاہ کی اور عرفات کی حیثیت عبادت گاہ کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں منیٰ مروہ کا اور میدان عرفات خانۂ کعبہ کا قائم مقام ہے۔ اس میدان میں اجتماعی عبادت دراصل خدا کے اصلی گھر خانۂ کعبہ میں عبادت کرنے کے مترادف ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تمام عبادات میں حج سب سے بڑی اجتماعی عبادت ہے۔ ایک ہی میدان میں، ایک ہی لباس میں، ایک ہی جذبہ و احساس کے ساتھ اہل ایمان کے ایک جم غفیر کا جمع ہونا بڑا دل کش اور اثر انگیز روحانی منظر ہوتا ہے۔ سب کی زبانوں پر خدائے قدوس کی تعریف وتمجید، اپنے گناہوں کا اقرار واعتراف اور طلب مغفرت، خطا وعصیاں سے پر گزشتہ زندگی پر اظہار ندامت اور آیندہ حقیقی ایمان اور عمل صالح کی حامل زندگی گزارنے کے عزم وداعیہ کے مکرر اظہار کی خفی اور جلی صداؤں سے میدان عرفات کی پوری فضا معمور ہوتی ہے۔ خدا پرستوں کا یہ انبوہ کثیر جس وقت کامل عجز وفروتنی اور ایک خاص دلی کیفیت کے ساتھ خدا کے حضور میں گریہ وزاری کرتا اور گناہوں کی معافی چاہتا ہے تو لا ریب رحمت الٰہی کا سمندر جوش میں آ جاتا ہے اور صدق دل سے توبہ کرنے والوں کے گناہ ضرور دھل جاتے ہیں۔

دوسری طرف اس عظیم اجتماع سے اسلام کی شان وشوکت اور مسلمانوں کے اتحاد واخوت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ میدان

---

[14] مولانا سید سلیمان ندوی، سیرت النبی ۳۷۰/۵۔ مولانا وحید الدین خان، حقیقت حج ۷۶۔

عرفات میں امام حرم کا خطبہ اس حقیقت کا مظہر ہے۔ یہ وہی میدان ہے جہاں کھڑے ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کا مشہور تاریخی خطبہ دیا تھا جو اس عظیم اجتماع کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ تھا، لیکن افسوس کہ آج حاجیوں کی اکثریت قیام عرفہ کی مذکورہ حقیقت واہمیت سے بالکل غافل ہے۔ ایک بھیڑ ہے جو ہر سال حج کے موقع پر یہاں جمع ہوتی ہے اور گناہوں کی رسمی معافی تلافی کے بعد منتشر ہو جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ

غروب آفتاب کے بعد میدان عرفات سے حاجیوں کی واپسی شروع ہوتی ہے اور مزدلفہ میں رات گزرانے کے لیے ٹھیرتے ہیں۔ مزدلفہ میں قیام کی غرض ذکر الٰہی کے تسلسل کو قائم رکھنا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

فَـاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡکُرُوۡا اللّٰہَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ وَاذۡکُرُوۡہُ کَمَا ھَدٰکُمۡ وَاِنۡ کُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیۡنَ.

''پھر جب تم عرفات سے چلو تو مشعر حرام میں ٹھیر کر خدا کو یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو ہدایت کی ہے۔ اس سے پہلے تم بلا شبہ صحیح راستے پر نہیں تھے۔'' (البقرہ ۲: ۱۹۸)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دور جاہلیت میں اہل عرب عرفات سے واپسی کے بعد مزدلفہ میں قیام تو کرتے، لیکن مشعر حرام کے پاس خدا کے ذکر و عبادت کے بجائے آبا واجداد کے مفاخر بیان کرتے تھے۔ اسلام نے جاہلیت کی اس رسم کو ختم کر کے اس کی جگہ ذکر خدا کی تلقین کی۔ مزدلفہ میں قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حجاج تھوڑا آرام کر لیں تاکہ دوسرے روز مستعد اور چاق و چوبند ہو کر منیٰ میں بقیہ اعمال حج انجام دے سکیں۔

قیام منیٰ

دسویں ذی الحجہ کو طلوع آفتاب کے بعد مزدلفہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہوتے ہیں اور تین روز یہاں قیام کرتے ہیں۔ دور جاہلیت میں عربوں نے قیام مزدلفہ کی طرح قیام منیٰ کے مقاصد کو بھی ضائع کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ منیٰ میں ذکر خدا کے بجائے مختلف تفریحی مشاغل میں وقت گزارتے تھے۔ مکہ کے دوسرے بازاروں (عکاظ و ذوالمجاز وغیرہ) کی طرح یہاں بھی ایک بڑا بازار لگتا تھا جہاں اہل عرب جمع ہو کر تجارت کرتے، داد و دہش کا مظاہرہ کرتے، قربانیاں کرتے اور محفل شعر و سخن منعقد کرتے تھے۔ ان محافل میں مشہور شعرا اور خطبا اپنی طلاقت لسانی اور زبان دانی کا مظاہرہ کرتے۔ ہر قبیلے کا شاعر اور خطیب اپنے اپنے قبیلہ کی شرافت و نجابت، کثرت تعداد اور شجاعت و سخاوت کے بیان میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتا جو بسا اوقات جنگ و جدل کی صورت اختیار کر لیتی۔ اسلام نے ان جاہلانہ مشاغل اور رسموں کو ختم کیا اور منیٰ کے قیام میں زیادہ سے زیادہ ذکر خدا کو لازم ٹھیرایا،[15] لیکن اس اجتماع کے دنیوی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ اجازت دی گئی کہ لوگ ذکر خدا کے ساتھ

باہم تعارف کی مجلسیں منعقد کریں، تاکہ دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمانوں میں اتحاد و اخوت کا رشتہ مضبوط ہو۔

قیام منیٰ کے اعمال میں رمی، قربانی اور حلق قابل ذکر ہیں۔ ان کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

رمی جمار

قیام منیٰ کے دوران میں ایام تشریق یعنی دسویں، گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کو تین مختلف سائز کے ستونوں پر کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ اسی کو اصطلاح حج میں رمی جمار کہتے ہیں۔ رمی کے بارے میں مشہور قول یہ ہے کہ ان مواقع پر شیطان نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کی قربانی سے باز آجائیں۔ انھوں نے اس کو کنکریاں ماریں یعنی رجم کیا۔ موجودہ رمی جمار اسی عمل کی یادگار ہے[16]۔ اکثر علمانے اسی قول کو لیا ہے۔ امام غزالی لکھتے ہیں:

> ''اس سے مقصود مجرد امتثال امر ہے تاکہ مکمل طور پر حکم الٰہی کے اتباع کا مظاہرہ ہو سکے۔ عقل و نفس کو اس میں کسی طرح کا حظ حاصل نہیں ہوتا۔ مزید برآں اس فعل کے کرنے میں حضرت ابراہیم سے تشبہ مقصود ہے، اس لیے کہ اس مقام پر ابلیس ملعون ظاہر ہوا تھا تاکہ آنجناب کے دل میں شبہ پیدا کرے یا کسی معصیت میں مبتلا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ اس کو کنکریاں ماریں تاکہ وہ ان کے پاس سے دفع ہو جائے اور اس کی (گمراہ کرنے کی) امید منقطع ہو جائے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت ابراہیم کے سامنے تو شیطان حقیقت میں ظاہر ہوا تھا اور آپ نے اس کو دیکھا تھا، اس لیے انھوں نے اس کو مارا تھا۔ میں نے شیطان کو نہیں دیکھا ہے، پھر کس لیے اس کو کنکریاں ماروں۔ اس کو جان لینا چاہیے کہ یہ شبہ بھی شیطان ہی نے پیدا کیا ہے اور اسی نے اس خیال کو تمھارے دل میں ڈالا ہے تاکہ شیطان کو ذلیل و خوار کرنے کا تمھارا ارادہ کمزور پڑ جائے اور تم یہ خیال کر بیٹھو کہ اس عمل سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ تو محض ایک کھیل تماشا ہے، اس لیے اس میں انہماک بے جا ہے۔ تم کو چاہیے کہ تم پوری دل جمعی اور ثابت قدمی کے ساتھ شیطان کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے کنکریاں مارو اور اپنے نفس سے اس کو دفع کرو اور یہ بھی جان لو کہ تم بادی النظر میں پتھر پر کنکریاں مارتے ہو، لیکن وہ درحقیقت شیطان کے منہ پر پڑتی ہیں اور اس کی کمر توڑ دیتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کی ذلت و خواری اس عمل سے سب سے زیادہ ہوتی ہے جس میں عقل اور نفس کے لیے کوئی سامان حظ نہیں ہوتا اور صرف اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اطاعت محض کے جذبے سے انجام دیا جاتا ہے۔''
>
> (احیاء العلوم ۱/۲۴۰)

دور آخر کے علما میں مولانا حمید الدین فراہی کا خیال اس سے بالکل مختلف ہے اور وہ اس میں منفرد ہیں۔ ان کے نزدیک

۱۵؎ واذکروا اللّٰہ فی ایام معدودات. (البقرہ ۲: ۲۰۳)

۱۶؎ ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ مینڈھا حضرت ابراہیم کے ہاتھ سے چھوٹ بھاگا تھا، اس وجہ سے حضرت ابراہیم نے جمرۂ اولیٰ، جمرۂ وسطیٰ اور جمرۂ کبریٰ کے پاس اس کو سات کنکریاں ماری تھیں۔ لیکن اس روایت کا ضعف بالکل واضح ہے اور اسی لیے اکثر علما نے اس کو نظر انداز کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رمی اصحاب فیل کی تباہی کی یادگار کے طور پر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حج اوراس کے تمام مناسک حضرت ابراہیم کے وقت سے چلے آ رہے ہیں۔ عربوں نے مناسک حج انھی سے سیکھے ہیں۔ چنانچہ کلام جاہلیت میں اجمالاً وتفصیلاً ان تمام باتوں کا ذکر موجود ہے۔ احرام، استلام، طواف، طیر حرم، صفا ومروہ، ہدی ونحر، زیارت عرفہ، وقوف منیٰ غرض خانۂ کعبہ اور حج سے متعلق ساری چیزوں کا ذکر آپ کو شعرائے جاہلیت کے شعروں میں مل جائے گا، لیکن رمی جمرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی چیز ہے اور واقعۂ فیل کے بعد وجود میں آئی ہے۔ چوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ایک بڑے احسان کی یادگار ہے اور اس کی قدرت قاہرہ کی ایک عظیم الشان نشانی تھی اس وجہ سے اسلام نے اس کو باقی رکھا اور حج کے مراسم میں شامل ہو کر اس نے تکبیر وتہلیل کی ایک مخصوص سنت کی حیثیت اختیار کر لی۔''

(تفسیر نظام القرآن ۴۰۳، ۴۰۴)

مختلف سائز کے تین ستونوں پر کنکریاں مارنے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:

''ابرہہ کی فوج پر پہلے روز جو سنگ باری ہوئی ہوگی، اس سے ایک حد تک نقصان اٹھا کر وہ آگے بڑھنے سے رک گئی ہوگی اور حجاج نے منیٰ میں واپس آ کر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور قربانی اور تکبیر وتہلیل کے فرائض ادا کیے ہوں گے، لیکن ابھی دم خم باقی رہا ہوگا، اس وجہ سے دوسرے دن پھر مکہ پر حملہ کرنا چاہا ہوگا، لیکن حجاج نے آگے بڑھ کر پتھراؤ کر کے روک دیا ہوگا۔ یہی واقعہ تیسرے روز بھی پیش آیا ہوگا یہاں تک کہ حجاج کی سنگ باری اور دست غیب کی کارفرمائیوں نے پوری فوج کو بالکل پامال کر دیا۔ چوتھی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ رمی کے تین دنوں میں سے پہلے دن صرف اس ستون پر کنکریاں مارتے ہیں جو عقبہ کے پاس اور تینوں ستونوں میں مکہ سے قریب تر ہے۔ اس روز بقیہ دو ستونوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ غور کرو تو واقعہ کی فطری ترتیب کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اصحاب فیل پہلے جوش میں تو مکہ کی طرف بڑھے ہوں گے اور مذکورہ حد تک پہنچ گئے ہوں گے، لیکن جب عربوں نے پتھراؤ کر کے چہرے بگاڑ دیے ہوں گے تو ان کا نشۂ جنگ تو ہرن ہو گیا ہوگا، لیکن عربوں کا جوش مدافعت مضاعف ہو گیا ہوگا اور حوصلہ بڑھ جانے کے سبب سے دوسرے دن انھوں نے اور آگے بڑھ کر مورچہ قائم کیا ہوگا۔ جس ستون پر پہلے روز رمی کی جاتی ہے، وہ تینوں میں سب سے بڑا ہے اور فوج کے حالات کے لحاظ سے یہی ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ پہلے دن کی شکست اور پامالی نے مقدمۃ الجیش کے حملہ آوروں کی تعداد بہت گھٹا دی ہوگی۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ دوسرے ستون کا حجم پہلے کے مقابلے میں کم ہو کر واقعہ کی پوری تصویر یادگار کے آئینہ میں محفوظ رہے۔''

(تفسیر نظام القرآن ۴۰۶)

رمی جمار کی یہ دو مختلف توجیہات ہیں جو اوپر پیش کی گئیں، لیکن راقم سطور کی نظر میں دونوں ہی توجیہات میں سقم ہے۔ جہاں تک روایت کا تعلق ہے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور صرف اس عمل (رمی) کی توجیہ کے لیے یہ گھڑ لی گئی ہے۔ اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب آسان نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ شیطان کو تین دن کیوں سنگ سار کیا جاتا ہے، پہلے دن صرف ایک ہی ستون (جمرۂ عقبہ) پر کنکریاں کیوں ماری جاتی ہیں، پھر کنکریاں مار کر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حاجی خانۂ کعبہ کا طواف کرنے کیوں جاتا ہے، کنکریاں مارنے کے لیے تین ستون اور وہ بھی مختلف سائز کے کیوں قائم کیے گئے ہیں، کیا شیطان بھی چھوٹا بڑا ہوتا ہے، اور کیا وہ تین کی تعداد میں حضرت ابراہیم کو بہکانے کے لیے آیا تھا، ہر بار ستون پر کنکریاں مارتے وقت تکبیر کیوں ضروری ہے، کیا خدا کے مقابلے میں شیطان اتنی بڑی قوت ہے کہ اس کی ظاہری پامالی پر اللہ کی کبریائی بیان کی جائے جو ساری کائنات کا بادشاہ ذوالجلال ہے وغیرہ؟ ان سوالات کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ بھی شیطان کی وسوسہ اندازی ہے جیسا کہ امام غزالی نے لکھا ہے۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں جو مطابق عقل نہ ہو، خواہ کسی وجہ سے وہ ہماری سمجھ میں نہ آتا ہو۔

رمی جمرات کے بارے میں قرآن وحدیث، دونوں خاموش ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحابۂ کرام اس معاملے کی اصل حقیقت سے بے خبر تھے۔ وہ یقیناً رمی جمار کی حقیقت سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال نہیں کیا، لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ رمی کی اصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی اور مذکورہ کم زور روایت نے اس کی جگہ لے لی اور صدیوں اسی روایت کے گرد ہمارا تقلید پرست ذہن گھومتا رہا۔ کسی نے تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کی۔

اس سلسلے میں مولانا فراہی کا خیال بلاشبہ تحقیق پر مبنی ہے اور ان کی اس بات میں بظاہر بڑا وزن ہے کہ شعراے جاہلیت کے کلام میں تقریباً تمام اعمال حج کا ذکر ہے، لیکن رمی جمار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رمی کا تعلق بعد کے کسی بڑے واقعے سے ہے، اور وہ واقعہ اصحاب فیل کا ہے جو عربوں کے قدیم اور محترم معبد کو ڈھانے کے ارادے سے آئے تھے، لیکن غور سے دیکھیں تو مولانا کی یہ تحقیق بھی عیب سے خالی نہیں ہے۔ اس توجیہ کو قبول کرنے کی صورت میں ایک بڑا اشکال یہ سامنے آتا ہے کہ پہلے دن کی رمی کے بعد قربانی اور حلق کے اعمال کیوں انجام دیے جاتے ہیں؟ بطور شکران اعمال کی انجام دہی کا مناسب وقت وہ ہے جب دشمن کی فوج پوری طرح پامال ہوچکی تھی یعنی تیسرے دن۔ اور اس دن بھی صرف قربانی قابل فہم ہے نہ کہ حلق۔

اس کے علاوہ ابرہہ کے لشکر کی تباہی کا معاملہ بھی قابل غور ہے۔ ابرہہ کو یہ بات معلوم تھی کہ عرب محترم مہینوں میں قتال سے احتراز کرتے ہیں، اسی لیے اس نے اس موقع پر اپنے ناپاک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کیا تھا۔ بلاشبہ، اگر ابرہہ نے کسی اور مہینے میں حملہ کیا ہوتا تو عرب جیسی بہادر قوم اپنے قومی معبد کو آسانی کے ساتھ منہدم ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی اور وہ یقیناً جس طرح بھی ممکن ہوتا، اس کا بے جگری سے مقابلہ کرتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ عربوں کی مزاحمت چنداں کارگر نہ ہوتی اور وہ ابرہہ کے لشکر جرار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جس کی تعداد لگ بھگ ۶۰ ہزار تھی اور ہر طرح کے حربی ساز وسامان سے لیس تھا۔ جنگ خندق (غزوۂ احزاب) کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کفار عرب کی متحدہ قوت بھی دس ہزار

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سے زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ عربوں نے ابرہہ کے لشکر پر سنگ باری کر کے اس کا چہرہ بگاڑ دیا، حد درجہ مبالغہ آمیز بات ہے اور رمی جمرات کو اس واقعے کی طرف منسوب کرنا کسی طرح صحیح نہ ہو گا۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ حج کے جملہ مناسک کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی سے ہے، اس لیے رمی جمار کو اس سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ راقم کے خیال میں رمی کا تعلق ہے تو شیطان ہی سے ہے، لیکن اس کا وہ مطلب نہیں جیسا کہ علما نے بتایا ہے کہ شیطان نے انسانی شکل میں آ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قربانی سے روکنا چاہا تھا، بلکہ اس سے مراد نفس اور اس کی وسوسہ انگیزی ہے۔ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں تو انھوں نے اولاً گمان کیا ہو گا کہ یہ محض ایک خواب ہے، اس لیے ناقابل توجہ ہے، لیکن تکرار خواب سے وہ بہت جلد حقیقت کی تہ تک پہنچ گئے اور ان کو شرح صدر ہو گیا کہ یہ خواب حقیقت پر مبنی ہے اور یہی اللہ کی مرضی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پہلے خیال پر یقیناً لاحول پڑھا ہو گا، اور پھر وہ تاریخی واقعہ ظہور میں آیا جس کے تصور سے آج بھی دل کانپ جاتا ہے۔ اس عمل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ثابت کر دیا کہ وہ اللہ کے غلام ہیں نہ کہ نفس کے جس نے انھیں بیٹے کی محبت کے بہانے سے حکم خدا کی تعمیل سے روکنا چاہا تھا۔

حج کے تمام اعمال سے بالکل ظاہر ہے کہ ان سے مقصود امر الٰہی کا امتثال اور نفس کی مخالفت ہے جو انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ منیٰ کے تین جمرات کا تعلق فی الواقع نفس امارہ سے ہے۔ ان پر کنکریاں مار کر جہاں حجاج اس سے اظہار برأت کرتے ہیں، وہاں اپنے اس عزم کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ وہ جب بھی خدا کی نافرمانی کے لیے اکسائے گا تو اس کی سرکوبی وہ اسی طرح کریں گے جس طرح آج منیٰ کے میدان میں اس کو تمثیلاً زدوکوب کر رہے ہیں۔

پہلے دن کی رمی کے بعد قربانی کی جاتی ہے اور سر کے بال منڈائے جاتے ہیں جو در اصل نفس امارہ کی قربانی اور اس کے بالمقابل خدا کی فرماں برداری اور اس کی غلامی کا اظہار و اقرار ہے۔ ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ اصلی قربان گاہ خانۂ کعبہ اور مروہ موقع ذبح اسماعیل ہے، اس لیے حجاج پہلے دن کی قربانی کے بعد مکہ پہنچ کر خانۂ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہیں اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی بھی۔ اس کے بعد منیٰ واپس آ کر بقیہ اعمال حج انجام دیتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ جمرات تین کیوں ہیں اور ان کے سائز مختلف کیوں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفس کی وسوسہ انگیزی کے کئی درجے ہیں۔ وہ ایک ہی بار اکسا کر خاموش نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ سلسلہ جاری رکھتا ہے[17]۔ اس کے علاوہ نفس کی وسوسہ انگیزی باعتبار قوت مختلف ہوتی ہے۔ پہلی بار یہ سخت و شدید ہوتی ہے، لیکن مزاحمت کا سامنا کرنے کے بعد اس کا زور کم ہوتا جاتا ہے۔ اسی بات کو تین مختلف حجم کے جمرات کی صورت میں علامتی طور پیش کیا گیا ہے۔

۱۷؎ الناس۔

قربانی

منیٰ کے میدان میں جو قربانی کی جاتی ہے، وہ حضرت ابراہیم کی قربانی (ذبح اسماعیل) کی یادگار ہے۔ یہ دراصل نفس کی مخالفت کا انتہائی عمل ہے۔ قرآن مجید میں قربانی کے جانور کو شعائر اللہ کہا گیا ہے[18]۔ شعیرہ کی جمع شعائر ہے جس کے معنی نشانی (Symbol) کے ہیں۔ معلوم ہوا کہ منیٰ میں جانور کی قربانی دراصل ایک علامتی قربانی ہے۔ ہم جانور ذبح نہیں کرتے، بلکہ اپنے نفس امارہ کو ذبح کرتے ہیں اور اس عمل کے ذریعے سے اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ ہماری نظر میں نفس کی حیثیت جانور سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کے حکم سے سرتابی کرے گا تو اس کو اس جانور کی طرح ذبح کر دینے میں معمولی تامل بھی نہ ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی کام کیا تھا۔ ایک طرف اکلوتے بیٹے کی محبت تھی اور دوسری طرف خدا کا حکم کہ اس کو خدا کی رضا کے لیے اپنے ہاتھوں سے ذبح کرو۔ بڑا کڑا امتحان تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ بیٹے کی محبت جو مرغوبات نفس میں داخل ہے، خدا کا حکم بجالانے میں حارج ہوتی اور نفس حیلہ جو کے فریب میں آ کر خدا کی حکم عدولی کر بیٹھتے، لیکن وہ اس عظیم امتحان میں پورے اترے۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ خدا کے بندے ہیں نہ کہ نفس کے، انھیں خدا کی رضا عزیز ہے نہ کہ دنیا کی متاع چندروزہ، جو خس وخاشاک کی طرح بے وقعت ہے۔ دل کی پوری رضا کے ساتھ خدا کی کامل فرماں برداری کا نام قرآن مجید کی زبان میں تقویٰ ہے جو تمام عبادات کا مقصود ہے۔ فرمایا گیا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ. (الحج ۲۲:۳۷)	''خدا تک نہ جانوروں کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، بلکہ اس تک جو چیز پہنچتی ہے، وہ تمھارا تقویٰ ہے۔''

قربانی کی اس حقیقت سے اکثر حجاج ناواقف ہیں۔ وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ حج تمتع اور حج قران کی صورت میں قربانی واجب ہے اور اس کا بڑا ثواب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جانور کی قربانی کے باوجود نفس امارہ کی سرکشی اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور زندگی کے اکثر معاملوں میں خدا کے حکم کے مقابلے میں نفس کا حکم اور اس کی خواہشات ہی غالب رہتی ہیں۔ کتنا بڑا تضاد ہے ہمارے ظاہر اور باطن میں۔

حلق راس

پہلے دن کی رمی سے فراغت کے بعد قربانی کی جاتی ہے اور سر کے بال مونڈے یا ترشوائے جاتے ہیں، اور یہی حلق ہے۔ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''سر منڈانے کا راز یہ ہے کہ اس سے احرام سے نکلنے کا ایک ایسا طریقہ متعین ہو جاتا ہے جو وقار کے منافی نہیں ہے۔ اگر

۱۸؎ والبدن جعلنٰها لکم من شعائر اللّٰه...الخ۔ (سورۂ حج ۲۲:۳۶)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ہر شخص جدا جدا راہ اختیار کرتا۔ اس کے علاوہ آشفتہ سری اور پراگندگی ختم ہونے کی علامت بھی ہے۔ اور یہ (حلق) ایسا ہے جیسے نماز میں سلام پھیرنا۔ طواف افاضہ سے قبل سر منڈانے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے، تاکہ اس کی حالت اس شخص کے مشابہ ہو جائے جو پراگندگی اور گرد و غبار کو دور کر کے بادشاہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔''

(حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۴۵)

راقم کے خیال میں حج کے دیگر ارکان کی طرح یہ عمل بھی ابراہیمی طریقے کی یادگار ہے۔ یہودیوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جو شخص خدا کی نذر کیا جاتا تھا، وہ اپنے سر کے بال اس وقت تک نہیں منڈاتا تھا جب تک کہ نذر کے دن پورے نہ ہو جاتے۔ تورات میں ہے:

''نذر کے دنوں میں اس کے سر پر استرہ نہ چلے، اور نذر کے دن جس میں وہ خود کو خداوند کے لیے علیحدہ کرتا ہے، پورے ہونے تک تقدس کے اظہار کے لیے اپنے سر کے بالوں کو بڑھائے۔'' (گنتی ۶:۶)

یہودی شریعت میں نذر کے یہ دن ساتویں روز پورے ہو جاتے ہیں اور آٹھویں روز نذر ماننے والا خیمۂ اجتماع کے دروازے پر خداوند کے لیے جانور کی قربانی پیش کرتا ہے اور خیمۂ اجتماع کے دروازے پر ہی وہ اپنے سر کے بال منڈاتا ہے[19]۔ ٹھیک اس قدیم طریقۂ عبادت کے مطابق جو یقیناً ابراہیم علیہ السلام کا طریقۂ عبادت رہا ہو گا، حاجی پہلے قربانی کرتا ہے، پھر بال منڈاتا ہے اور پھر مکہ جا کر بیت اللہ کا طواف کرتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حلق راس کی ایک اور حکمت بھی ہے۔ عہد قدیم میں دستور تھا کہ جو شخص غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا، اس کے سر کے بال منڈوا دیے جاتے تھے اور یہ غلامی کی علامت سمجھی جاتی تھی[20]۔ حج کیا ہے؟ خدا کی غلامی اور اس کی دائمی اطاعت کا عہد و پیماں۔ اور حلق راس سے یہی مقصود ہے۔

افسوس کہ اکثر مسلمان حلق راس کی اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ حج سے واپسی کے بعد ان کے بال دوبارہ معمول کے مطابق ہو جاتے ہیں اور خدا کی غلامی کی کوئی نشانی باقی نہیں رہتی۔ ان کے اعمال سے بھی ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ وہ مکہ کی مقدس سرزمین سے خدا کی غلامی کا عہد و اقرار کر کے لوٹے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

---

[19] گنتی ۶:۱۳، ۱۸۔

[20] طبقات ابن سعد ۲/ ۳۷، سیرۃ ابن ہشام، ذکر بیر معونہ، واقعہ عمرو بن امیہ، بحوالہ سیرت النبی ۵/ ۳۷۲۔